آجکل

اگست ۲۰۰۳ء — سات روپے



ڈی۔پی۔مکرجی

موسیقی کے عظیم استاد — جنہیں میں نے سنا

موسیقی کی اپنی پچاس سالہ واقفیت اور تیس سالہ شعور کی مدت میں مجھے ہندوستان کے کبھی مانے ہوئے استادوں کو روایت کی حدود میں سننے کا موقع ملا ہے۔ ان میں سے اکثر شمال کے اور کچھ جنوب کے رہنے والے ہیں۔

پہلے میں گویوں کو لیتا ہوں۔ ان میں بہتر الاپئے اللہ بندے خاں اور نصیر الدین خاں ذاکر الدین کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ ذاکر الدین کو میں نے ایک مرتبہ سنا۔ لیکن ان کے بھائی اللہ بندے خاں اور بھتیجے نصیر الدین خاں میرے زمانے میں چوٹی کے الاپئے تھے۔ ان کے سُر اس قدر نپے تلے تھے کہ غلطی کا امکان ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے قدیم روایت پر چلتے ہوئے راگ کو ترقی دی۔ ان کی آواز لچک دار تھی اور راگ روپ مکمل تھا۔ وہ دربار کا ماحول پیدا کر سکتے تھے۔ میں نے وشنو دگمبر، گھورے، چکرورتی اور دوہم مرتی وغیرہ کے گیرے اور دھرپد بھی سنے ہیں لیکن جدید ہندوستان میں جہاں تک شان اور تمکنت کا تعلق ہے ان الاپیوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ جب میں یہ الزام سنتا ہوں کہ ہندوستانی موسیقاروں کو سُر اٹھانے کی کوئی تربیت نہیں دی جاتی تو مجھے ان کی یاد آجاتی ہے۔ صرف ان کے گلے ہی اس الزام کو جھٹلا سکتے تھے......

میرے خیال میں دھرپد کے بہترین استاد رادھیکا پرساد گوسوامی اور وشوناتھ راؤ تھے۔ ہمارے کالج کے زمانے میں انہوں نے دھرپد کا پرچم بلند کیے رکھا۔ میں نے دھرپد دوسرے لوگوں سے بھی سنا ہے لیکن اصل دھرپدیے وہی تھے جنہیں میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ دھرپد سے ضبط اور وقار کا جو احساس وابستہ ہے میری ناچیز رائے میں گوالیار اسکول وہ پیدا نہیں کرتا۔ شاید سوامی جی کے پاس دیس بھر میں دھرپد کے گیتوں کا خزانہ سب سے زیادہ تھا۔ ان کی آواز نہایت عمدہ تھی اور لے کا احساس بہت ہی ترقی یافتہ تھا۔ وہ صنعت کی صنعت کے لیے کبھی نمائش نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی توجہ راگ اور گیت کی اسپرٹ پر مرکوز ہوتی تھی۔ ان کا تلفظ بسا اوقات درست نہیں ہوتا تھا اور نہ ان کی وشنو دگمبر، نصیر خاں یا فیاض خاں جیسی شخصیت تھی کیونکہ وہ فطرتاً شرمیلے تھے۔ اس کے برعکس ان کے مد مقابل وشنو راؤ بالکل مختلف آدمی تھے۔ ان کی آواز سریلی نہیں تھی، اکثر بے سر بھی ہو جاتے تھے اور نمائش و نمود کے دلدادہ تھے۔ تاہم معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے فن میں مرد میدان ہیں۔ وہ کامیاب گویے تھے اور ان کی لے کاری شاندار تھی۔ مجھے ان کی بسنت کبھی نہیں بھولے گی جو وہ پنچم کے بنا اور سدھا عبرات کے ساتھ گاتے تھے......

اب میں بڑے خیالیوں کی طرف آتا ہوں...... اور میں اپنے نوجوان قارئین کو بتانا چاہتا ہوں کہ جس 'خیال' سے ان کے کان اس قدر آشنا ہو چکے ہیں (وہ) کل تک اونچی کلاسیکل موسیقی میں شمار نہیں ہوتا تھا۔ مقصد اس کی حیثیت کم کرنا نہیں۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ خیال جو آج کلاسیکل اسلوب کا دوسرا نام ہے، میری زندگی میں دیر سے آیا۔ لکھنؤ میں جہاں میں نے کلاسیکل موسیقی کی تربیت حاصل کی، ان دنوں موسیقی کا مرکز تھا۔ خیالیے دھرپدیوں سے دوسرے درجے پر شمار ہوتے تھے اور ان دنوں بہت کم خیالیے ہوتے تھے۔ بچھی مصر ان میں بہترین تھے۔ شو اور پشوپتی مصر بعد میں آئے۔ ہم پبلک طور پر صرف دھرپد، خیال اور ٹپے پرائیویٹ طور پر سنتے تھے۔ البتہ میں نے گوہر جان کو سنا ہے جو مرحوم پنڈت بھات کھنڈے کے قول کے مطابق ہندوستان بھر کی گانے والیوں میں خیال اور ٹھمری کی بہترین گائک تھی۔ لیکن میں نے ایک مرتبہ کے علاوہ انہیں ہمیشہ پرائیویٹ طور پر سنا ہے۔ یقیناً خیال کے بڑے استادوں میں ان کا مقام ہے۔ مجھے ایک موقعہ ایسا بھی یاد ہے جب انہوں نے 'اڈانہ' دھرپد میں گایا اور دوسرا سادرا میں اور تیسرا خیال میں۔ اس کے بعد اگر ملک کے بہترین سے بہترین گویے نے بھی اڈانہ گایا تو میرے لیے اس پر توجہ مرکوز کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ ایک شاندار اور دلکش شخصیت کی مالک تھیں۔ ان کے بعد بھی خیال کی اچھی اچھی گانے والی موجود ہیں لیکن میں انہیں استاد نہیں کہوں گا۔ وہ بلاشبہ بہت ہی عمدہ گاتی ہیں، لیکن گوہر جان نے خیال کا جو معیار قائم کر دیا ہے اس سے ذرا نیچے ہی رہتی ہیں۔

گوہر جان اور زہرہ بائی کے علاوہ جن کا آپس میں کوئی مقابلہ نہیں، اللہ دیا خاں، کرامت خاں، فیاض خاں اور عبدالکریم خاں جن کے میں نے صرف ریکارڈ سنے ہیں، خیال کے استادوں کی ذیل میں آتے ہیں۔ مجھے کالے خاں کو دو مرتبہ سننے کا اتفاق ہوا لیکن وہ اپنے بہترین رنگ میں نہیں تھے۔ ان سب میں ہر ایک کا اپنا اپنا میدان ہے۔ مثلاً اللہ دیا خاں تان میں بے نظیر ہے، کرامت خاں استھائی میں، فیاض خیال کی ادائی میں اور عبدالکریم خاں سر کو نیچا اُتارنے میں۔ بلاشبہ ہر ایک ہندوستانی موسیقی کی حدود میں آزادانہ طور پر پرواز کرتا ہے۔ فیاض خاں کو دھمار، ٹھمری اور غزل میں بھی اتنی ہی دسترس حاصل ہے اور عبدالکریم خاں کی ٹھمری کو کون نہیں جانتا۔ مجموعی طور پر ان استادوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا اسلوب ڈرامائی ہے اور دوسروں کا متفکرانہ۔ فیاض خاں اسٹیج پر آتے ہی سامعین کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے وہ گیت پر باز کی مانند جھپٹتے تھے۔ بعد ازاں وہ الاپ سے سر کو اونچا اٹھاتے تھے۔ ان کی تانیں بھی کردار اور ادائی میں بدلتی رہیں۔ پہلے پہل وہ آگرہ اسکول کے خاص کتھک کی طرح کبھی ایک سر کو اونچا اٹھاتے تھے اور کبھی ایک سر کے گرد تانیں بنتے تھے۔ مگر جب انہوں نے پختگی حاصل کر لی تو وہ اپنی تانوں میں تناسب قائم کرنے لگے۔ عبدالکریم خاں ہمیں سنگیت کے مندر میں مدعو کرتے جس کے وہ پروہت تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ قدامت پسند گویے تھے۔ وہ ایک ہی گیت کو کبھی ایک سر میں نہیں گاتے تھے۔ ان کی استھائی ہمیشہ ہیئت کی پابند نہیں ہوتی تھی۔ وہ یکے بعد دیگرے، بہت سے سر نکالتے تھے اور غیر متوقع تنوع پیدا کرتے تھے۔ ان کا احساس تغیر گوالیار یا پونہ اسکول والوں یعنی راجا بھیا، شنکر پنڈت، رام کرشن واژے یا بھاسکر راؤ، بالا جی راؤ اور ایک ناتھ پنڈت جی کے متعدد شاگردوں کے مقابلے میں کم ترقی یافتہ تھا۔ لیکن جب عبدالکریم گا رہا ہو تو کون پروا کرتا تھا۔ یہ آدمی جینئس (Genius) تھا۔ رحمت خاں سے جو کچھ سیکھا جا سکتا تھا، سیکھا اور پھر خیال کو نئی زندگی عطا کی۔ خیال کے آج بہترین گویے یا تو ان کے شاگرد ہیں یا شاگردوں کے شاگرد۔ انہوں نے ایک نئے اسلوب کی داغ بیل ڈالی اور ہندوستانی موسیقی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا......

گو واجد علی شاہ نے کلکتے سے تھوڑی ہی دور مٹیا برج میں رہائش اختیار کر لی تھی لیکن ہریسن روڈ پر ہمارے اسکول کی تیسری منزل پر ایک کمرے میں ٹھمری اسکول کی

باقی ٹائٹل ۳ پر

ایک بین اقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایگزیکٹیو ایڈیٹر
عابد کرہانی
فون: 24369189

معاون
نرگس سلطانہ

جلد: ۶۲ شمارہ: ۱

اگست ۲۰۰۳ء ساون-بھادوں شک ۱۹۲۵

کمپوزنگ: افتخار احمد

سرورق: نول کشور

جوائنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): ڈی این گاندھی

بزنس منیجر (ہیڈ کوارٹرز): جگدیش پرساد "بھارتی"

آجکل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فی شمارہ: سات روپے — سالانہ: ۷۰ روپے

دو سال: ۱۳۵ روپے — تین سال: ۱۹۰ روپے

امریکہ، یورپ اور دوسرے ممالک کے لیے بذریعہ ہوائی ڈاک سالانہ ۷۰۰ روپے

پڑوسی ممالک کے لیے بذریعہ ہوائی ڈاک سالانہ ۵۰۰ روپے

خریداری، اشتہار کے لیے منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ، پوسٹل آرڈر
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن کے نام اس پتے پر بھیجیں

سرکولیشن منیجر (جرنلس) یونٹ ایسٹ بلاک ۴، لیول ۷، آر کے پورم، نئی دہلی-۶۶

رسالے سے متعلق استفسار اور شکایتیں بھی سرکولیشن منیجر کو ہی لکھیں

صرف تخلیقات سے متعلق خط-کتابت کا پتا:

ایڈیٹر 'آجکل' (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ۱۳۵، سوچنا بھون
سی جی او کمپلیکس، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۳

ترتیب

ملاحظات

"**آجکل**" (اردو) کے مخصوص مزاج ومعیار کو قائم رکھنا اور حتی الوسع اس کو معنوی اور صوری اعتبار سے بہتر سے بہتر بنانے کی سعی کرنا سب سے اہم مسئلہ ہے جو ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بقول مجروح:

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے، دیوار کی طرح

پھر بھی کوشش کی جائے گی کہ ہماری سعی، تمام بہی خواہان 'آجکل' کی توقعات پر پوری اترے۔ لیکن یہ سعی اور یہ کام اس وقت تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا جب تک ہمیں اپنے معتبر و معتبر شعرا اور ادبا، ناقدین فن، افسانہ نگار، مزاح نگار اور محققین کا بھرپور تعاون حاصل نہ ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ دفتر 'آجکل' میں مضامین نثر و نظم کی کمی ہو۔ بلکہ صورت حال تو یہ ہے کہ دفتر 'آجکل' میں موصولہ مضامین / نظموں / غزلوں / افسانوں کا انبار لگا رہتا ہے لیکن 'رد و قبول' کے مراحل سے گزر کر کتنے 'گوہر آب دار' ہمارے ہاتھ لگتے ہیں، یہ الگ بات ہے۔ چنانچہ اپنے مذکورہ مقصد کے حصول کے لیے تمام اہم اہل قلم حضرات سے فرداً فرداً خط لکھ کر گزارش کی گئی ہے کہ اپنے گراں قدر رشحات قلم سے 'آجکل' کو نوازیں۔ اس کے ساتھ ہی آج کی نوجوان نسل کے لکھنے والوں سے بھی درخواست ہے کہ وہ اپنا قلمی تعاون ہمیں دیں۔ نئی نسل بے نیاز بن ہے۔ آج کی دنیا میں موضوعات اور وہ بھی نادر موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ اچھوتے موضوعات پر (یا پرانے موضوعات پر اچھوتے انداز سے) مضامین، افسانے، نظم غزل، انشائیے، مزاحیے وغیرہ تحریر کر کے ہمیں ارسال کریں۔ عمدہ اور معیاری تحریروں کے لیے، بھلے ہی وہ جدید سے جدید نسل کے لکھنے والوں ہی کے کیوں نہ ہوں، 'آجکل' کے صفحات ہر وقت حاضر ہیں۔ بس شرط اتنی ہی ہے کہ یہ تحریریں 'آجکل' کے مزاج و معیار سے ہم آہنگ ہوں۔

'آجکل' ایک ادبی رسالہ ہے اس لیے ظاہر و باہر ہے کہ اس کے مضامین نثر و نظم کا Bulk علمی، ادبی، فنی موضوعات پر ہی مشتمل ہوگا لیکن غیر علمی / ادبی مواد بھی 'آجکل' کے لیے شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ 'آجکل' جو اردو ادبی جرائد و رسائل کی تاریخ میں اپنا ایک نمایاں مقام بنا چکا ہے، کی ۶۲ سالہ تاریخ شاہد ہے کہ فنون لطیفہ، سائنس اور تمدن، خلائی تحقیق، ماحولیات وغیرہ جیسے موضوعات پر پروفیشنل تحریروں سے "آجکل" کے صفحات کبھی خالی نہ رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر مذکورہ موضوعات پر الگ سے نہ بھی لکھا جائے تو ادب ایک ایسا ہمہ گیر اور طاقتور میڈیم ہے جو اپنے دامن میں کہیں نہ کہیں ان موضوعات کو بھی سمیٹ لیتا ہے۔ بھلے ہی وہ ایک Subtle way کی شکل میں کیوں نہ ہو۔ ہمارے خیال میں یہی Subtlety ہے جو ادب کو غیر ادب سے ممیز کرتی ہے۔ لیکن وقت کی ضرورت یہی ہے کہ ان موضوعات پر جم کر معروضی انداز میں اور سیر حاصل طور پر لکھا جائے۔ Specialisation کا زمانہ ہے۔ کمپیوٹرائزیشن، نئی مواصلات اور برقی ذرائع ابلاغ کا دور دورہ ہے۔ دنیا ایک عالمی گاؤں بن چکی ہے۔ ہم اپنے آپ کو محض ایک خاص دائرے یا خانے میں محصور و محبوس کر کے نہیں رکھ سکتے۔

بہر حال ہمارا مقصد یہاں ادب اور غیر ادب کی بحث اٹھانا نہیں ہے بلکہ نوجوان ذہن کو دعوتِ فکر اور دعوتِ تحریر دینا ہے کہ وہ علمی، ادبی موضوعات کے ساتھ ساتھ، گاہے بہ گاہے، ان جدید عصری موضوعات پر بھی قلم اٹھائیں جنھوں نے بیسویں صدی کی دنیا کو منور کیا ہے اور اکیسویں صدی جن کی چکا چوند میں آگے بڑھ رہی ہے۔

قارئین سے ہمارا وعدہ ہے کہ 'آجکل' میں شائع ہونے والے مقالوں، نظموں، غزلوں، افسانوں اور دیگر تخلیقات کو پروف کی اغلاط سے پاک کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔ پر مغز مقالات کے ساتھ ساتھ انسانی فکر کو جھنجھوڑنے والے عمدہ افسانوں اور کہانیوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا تاکہ فکشن کے دلدادہ قارئین کی دلچسپی برقرار رہے۔ تبصروں کے معیار پر بھی توجہ دی جائے گی اور Lay-out میں بہ حیثیت مجموعی تبدیلی لانے کی کوشش کی جائے گی۔ امید کہ ان معروضات پر قلم کار و قارئین حضرات غور فرمائیں گے اور اپنے بیش قیمت مشوروں نیز گراں قدر آرا سے بھی مستفید کریں گے۔

وفیات

نامور شاعر **امیر قزلباش** کا ۲۵ رمئی کو نئی دہلی میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً ۶۵ برس تھی۔ وہ گزشتہ چار ماہ سے علیل تھے۔

پرانی دہلی میں پیدا ہوئے امیر قزلباش کے چار مجموعہ ہائے کلام "بازگشت"، "انکار"، "رجز" اور "شکایتیں میری" منظر عام پر آچکے ہیں۔ "بہترین شاعر" کے اردو اکادمی ایوارڈ یافتہ امیر قزلباش نے مشہور اداکار اور فلم ساز راج کپور کی دو فلموں 'پریم روگ' اور 'رام تیری گنگا میلی' کے لیے بھی گیت لکھے تھے اور دوردرشن کے لیے چند سیریل بھی بنائے تھے۔ امیر قزلباش آل انڈیا مشاعروں کے ہر دلعزیز شاعر تھے اور ملک کے علاوہ بیرون ممالک کے عالمی مشاعروں میں بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ اور ایک بیٹی شامل ہیں۔

ممتاز شاعر **کرشن بہاری نور** ۳۰ رمئی کو صبح ساڑھے دس بجے ۷۷ سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ پسماندگان میں پانچ بیٹیاں اور ایک

بیٹا ہے۔ مشترکہ تہذیب کی علامت کرشن بہاری نور اردو اور ہندی کے قومی اور بین الاقوامی مشاعروں میں کافی مقبول تھے۔ ان کے کئی مجموعہ کلام منظر عام پر آچکے ہیں۔

دبستان عظیم آباد کے نامور شاعر **وفا ملک پوری** کا یکم جون کو پورنیہ میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۹۰ سال کے تھے اور گزشتہ دو ماہ سے فالج کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ ان کا شمار کلاسیکی شعراء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے مشہور ماہنامہ 'صبح نو' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ وفا کے دو شعری مجموعے 'شاہراہ وفا' اور 'حرف وفا' شائع ہو چکے ہیں۔ وفا ملک پوری کے پسماندگان میں چار بیٹے، تین بیٹیاں اور ان کی اہلیہ ہیں۔

دبستان لکھنؤ کے معروف شاعر **میکش یوسفی** کا ۳/ جون کو لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم میکش یوسفی زبان و بیان پر قدرت رکھنے والے کہنہ مشق شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

اردو کے مشہور، ممتاز صحافی جناب **نازش انصاری** کا ۱۲/ جون ۲۰۰۳ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور اہلیہ شامل ہیں۔ مرحوم نازش انصاری نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز علی گڑھ سے کیا تھا۔ چھٹی دہائی میں وہ دہلی آگئے تھے۔ یہاں انہوں نے ماہنامہ 'روبی'، 'بیسویں صدی'، 'فلمی ستارے'، 'گلفام' اور 'تیز گام' جیسے جرائد میں صحافتی خدمات انجام دیں۔ مرحوم انصاری مشہور رسالہ ماہنامہ 'جرائم' سے بھی وابستہ رہے۔

اردو کے نامور ادیب و شاعر **ابوالفیض سحر** کا گزشتہ ۲۲/ جون کی رات میں انتقال ہو گیا۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ ڈاکٹر ابوالفیض سحر ۱۹/ فروری ۱۹۳۰ء میں علاقہ جہاں نما، اودھ گنج، حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ عثمانیہ کالج حیدر آباد سے اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

مرحوم ترقی اردو بورڈ (اب "قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان") کے کئی اعلا عہدوں پر فائز رہے اور مختلف جہات میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' اور سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کے ایڈیٹر، گجرال کمیٹی، سرور کمیٹی اور جامعہ اردو علی گڑھ کے رکن، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی اور انجمن ترقی اردو (ہند) نیز وزارت داخلہ اور اردو سے متعلق کئی سرکاری و غیر سرکاری اداروں سے بحیثیت مشیر وابستہ رہے۔

مرحوم کی تصنیفات میں تیشۂ نظر (تنقیدی مضامین)، خسرو شناسی (تحقیقی مقالات) اردو ہندی لغت (تالیف) شامل تھیں۔ دہلی اردو اکادمی، یوپی اردو اکادمی اور بہار کے انعامات سے بھی نوازے گئے۔

مرحوم کو قبرستان پنج پیران، حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں سپرد خاک کیا گیا۔

ادارہ مذکورہ تمام شعراء و ادباء کے انتقال کو اردو زبان و ادب کا ناقابل تلافی نقصان تصور کرتا ہے اور اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ☆☆

ہماری اردو مطبوعات

قلم، قلم کار اور کتاب	عبدالغنی شیخ	110/=
آجکل اور غبار کارواں	ادارہ	170/=
آجکل کی کہانیاں	ادارہ	162/=
آجکل اور سفرنامہ	ادارہ	105/=
آجکل اور صحافت	ادارہ	115/=
آجکل کے ڈرامے	ادارہ	125/=
آجکل کے مضامین	ادارہ	112/=
آجکل اور اقبال	ادارہ	95/=
آجکل اور طنز و مزاح	ادارہ	112/=
اردو ادب کے پچاس سال	ادارہ	95/=
اٹھارہ سو ستاون	سریندر ناتھ سین / خورشید پروین	556/=
کلاسیکی موسیقار	مترجم خورشید اکرم	137/=
عوام الناس کے لیے گائڈ	مترجم عادل صدیقی	145/=
مہاتما گاندھی	آچاریہ کرپلانی / لکشمی چندر داس	300/=
مہاتما بدھ کی حکایتیں	پال کاروس / مسعود فاروقی	155/=
شہیدوں کے خطوط	ادارہ	110/=
قلی قطب شاہ	نریندر لوتھر / زبیر رضوی	280/=
سفینۂ غالب	ادارہ	95/=
آئینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	75/=
گنجینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	60/=
یادیں مجاہدین آزادی کی	نوین جوشی / راحت جبیں	120/=
غالب پہ صد انداز	تشکیل: بریندر سیال	1000/=
پہیلیاں - امیر خسرو	مرتب شہباز حسین، تنڈشور وکرم	22/=
کاغذی ہے پیرہن	عصمت چغتائی	65/=
کشمیر کی لوک کتھائیں	جے۔ این۔ کنبر	45/=
ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر	ڈاکٹر محمد عمر	127/=
راگ راگنیوں کی تصویریں	تشکیل الرحمن	325/=
ہند اسلامی طرز تعمیر	ضیاء الدین ڈیسائی / اختر الواسع	54/=
ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز	ضیاء الدین ڈیسائی / بہار برنی	54/=
ہماری تہذیبی وراثت	راجندر پرشاد / بی این پانڈے	50/=

نوٹ: کتابیں اور رسالے منگوانے کے لئے رقم پیشگی ارسال کریں۔
کتابیں کسی بھی صورت میں وی پی سے نہیں بھیجی جائیں گی۔

ملنے کا پتہ: بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔۱

شکیل الرحمٰن

جشنِ زندگی کا شاعر

نظیر اکبر آبادی

نظیر اکبر آبادی جشن زندگی (Celebration of Life) کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ ان کی جمالیات کے دائرے میں انسان، ان کی تمدنی اور تہذیبی زندگی، مناظر حسن و جمال، مظاہر کائنات، رقص حیات، محبتوں کے نغمے، قہقہے، مختلف قسم کی خوبصورت آوازوں کا آہنگ سب شامل ہیں۔ شاعر نے پورے معاشرے کو گرفت میں لینے کی کوشش کی اور معاشرے کے جمالیاتی نقوش شاعری کی گرفت میں آگئے۔

نظیر اکبر آبادی نے عوام کے مختلف طبقوں کی جمالیاتی تربیت میں حصہ لیا ہے، شاعری اور عوام کی مادی اور روحانی زندگی میں گہرا رشتہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح ان کی جمالیات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ہے۔ انہوں نے ماضی کے جمال اور اسطور کے حسن کو بھی عزیز رکھا ہے، غزلیں اور نظمیں لکھیں، قصیدے لکھے، مثنویاں اور رباعیاں لکھیں، مسدس اور ترجیع بند کے علاوہ فارسی شاعری سے بھی اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا، فارسی میں بھی غزلیں کہیں، حافظ، سعدی اور امیر خسرو کی غزلوں پران کا ہر خمسہ توجہ کا مرکز ہے۔ مشاہدوں کا اتنا بڑا شاعر اردو ادب میں پیدا نہیں ہوا۔ مشاہدہ کرتے ہوئے جزئیات پر بڑی گہری نظر ملتی ہے۔ نظیر نے جتنے الفاظ گڑھے ہیں اس کی مثال نہیں ملے گی، ایک طرف فارسی اور اردو تہذیب کے روایتی الفاظ ملتے ہیں اور دوسری طرف کھڑی اور برج کے سیکڑوں الفاظ ملتے ہیں، انہوں نے ڈکشن کا ایک بہت بڑا سرمایہ چھوڑا ہے اور یہ اردو زبان وادب کے لیے ایک بڑی نعمت ہے۔ نظیر اس طرح ایک ادبی روایت بھی بن جاتے ہیں۔ ایسی روایت کہ جس سے محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالیؔ بھی ایک گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ ان کے بعد میر انیسؔ، جوش ملیح آبادی اور احسان دانش وغیرہ تک ان کے ڈکشن اور انداز بیان کی پہچان ہوتی ہے۔ محمد حسین آزاد جو خود نظیر کے ڈکشن اور اسلوب سے متاثر ہیں "آب حیات" میں اس شاعر کو اپنے اصولوں کے پیش نظر نظر انداز کر دیتے ہیں، ولیؔ کے حالات کے ذکر میں "اصولوں" کے پیش نظر نظیر اکبر آبادی کا ذکر اس طرح آیا ہے:

"نظیر کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ میرؔ سے پہلو مارتے ہیں، پس اگر نظیر کا ذکر لکھ کر اور اس کے چند شعر منتخب لکھ دیے جائیں تو ناواقف سوائے اس کے کہ نظیر کو میر کا ہم پلہ شاعر سمجھے اور کیا تصور کر سکتا ہے۔"

(آب حیات)

یہ قبول کرتے ہیں کہ نظیر کے بعض اشعار میر سے پہلو مارتے ہیں لیکن انہیں اہمیت دینا نہیں چاہتے۔ حالانکہ ان کا بنیادی اصول یہ ہے کہ منتخب کلام پیش کر دیا جائے اور خوبیاں بتائی جائیں وہ نظیر کے تغزل کا ذکر تو کر ہی سکتے تھے ایسے اشعار تو ان کی نظر سے گزرے ہی ہوں گے:

خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ہاتھ سے لو — مجھے بو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی
میں اس لیے اس کے منہ چومتا ہوں غنچے کا — کہ کچھ نشانی ہے ان میں ترے دہن کی سی

☆

نہ سرخی غنچۂ گل میں ترے دہن کی سی — نہ یاسمن میں صفائی ترے بدن کی سی
گلوں کے رنگ کو کیا دیکھتے ہوائے خوباں — یہ رنگتیں ہیں تمہارے ہی پیرہن کی سی

☆

یہ غنچہ جو بے درد گل چیں نے توڑا — خدا جانے کس کا یہ نقش دہن تھا

حیرت ہے، تذکرہ نگاروں کو جو خامیاں نظیر کے کلام میں نظر آئیں وہ میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، میر حسنؔ وغیرہ کے کلام میں بھی موجود ہیں اس کے باوجود انہوں نے نظیر اکبر آبادی کے کلام کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مناسب تصور نہیں کیا۔ ان خامیوں کی نشاندہی کر کے رہ گئے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مولانا شبلی نے بھی کلام نظیر کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ اردو ادب میں جشن زندگی کے اس بڑے شاعر کے مزاج اور رجحان کی پہچان مندرجہ ذیل نظموں سے ہو جاتی ہے۔

"بہار، چاندنی، برسات کا تماشا، برسات کی بہاریں، جاڑے کی بہاریں، شب برأت، عید، عیدالفطر، بسنت، ہولی (کم و بیش دس نظمیں) دیوالی، راکھی، بلدیو جی کا میلا، کبوتر بازی۔" نظیر زندگی کے تحرک اور حسن و جمال پر عاشق ہیں، وہ ہر لمحے کو غنیمت جانتے ہیں، اس بات کا احساس ہے کہ زندگی مختصر ہے لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ جشن زندگی کو سمجھا جائے اور اس کی قدر کی جائے، یہ جشن موسموں کا ہو یا تمدنی اور

مدعو بن اے۔ ۲۶۷، ساؤتھ سٹی، گڑگانواں، ہریانہ ۱۲۲۰۰۱

لہٰذا یہی زندگی کا، قدرت کا جشن مسلسل جاری رہتا ہے، اس سے لطف اندوز ہوتے رہو ہنستے مسکراتے رہو اس لیے کہ محبتوں اور زندگی کے جمال کے دن تھوڑے ہیں اس دنیا سے گزر جانا ہے۔ ان کی ایک پیاری سی نظم ہے "حسن و جمال کو غنیمت جانو" اس سے شاعر کے درد کے رشتے کی فوراً پہچان ہو جاتی ہے ان کا کہنا یہی ہے:

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

چند بند ملاحظہ فرمائیے:

اپنے غم خواروں سے کوئی آن ہنس لے بول لے — درد مندوں کا نکال ارمان ہنس لے بول لے
پھر کہاں یہ دل مری یہ شان ہنس لے بول لے — دم غنیمت ہے ارے نادان ہنس لے بول لے
مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے
حسن کا عالم ستم گر ہر گھڑی ملتا نہیں — گل بھی کھل اک بار اے جاں پھر کبھی کھلتا نہیں
مجھ سے تیرا روٹھنا ہر دم کا اب جھلتا نہیں — دودھ اور دل جب پھٹا پیارے یہ پھر ملتا نہیں
مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

اس نظم میں محبوب سے مخاطب ہو کر وقت اور لمحوں کے حسن کا احساس طرح طرح سے دیا ہے۔ بار بار کہتے رہے ہیں کہ وقت رکنے ٹھہرنے والا نہیں ہے یہ تیزی سے گزرتا جا رہا ہے اور پھر گزر جائے گا، حسن گم ہو جائے گا، یہ جو حسن ہے وہ صرف دو دن کا ہے لہٰذا جشن زندگی میں اپنے پورے وجود کو لیے اور اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ شریک ہو جاؤ، لمحوں سے لطف اندوز ہو کر جمالیاتی مسرت اور شادمانی حاصل کرو، محبوب کو سوچنا چاہیے کہ اس کا جمال ہمیشہ قائم نہیں رہے گا ایسا کوئی حسن والا نہیں کہ جس کی خوبی کا ہمیشہ ایک سا عالم رہا ہو۔

کیوں خفا ہوتا ہے ہم سے یاد رکھ اے دل ربا
ہاتھ آتا ہے نہیں کافر یہ جب جوبن گیا!

نظیر زندگی کے جشن میں شریک ہیں اور جشن میں شریک ہونے کی دعوت دیتے رہتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ زندگی مختصر ہے، زندگی سے مایوس نہیں ہوتے۔

اچھے ادب کی ایک بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی جمالیاتی تشریح اس طرح کرتا ہے کہ قاری زندگی کے تضاد اور انتشار کو سمجھتے اور تضاد اور انتشار کے تجربوں کو حاصل کرتے رہنے کے باوجود فنکار کے پیش کیے ہوئے تجربوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے اور جمالیاتی آسودگی اور جمالیاتی انبساط پاتا رہتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی سات رنگوں کے شاعر ہیں۔ انہوں نے ایک قوس قزح کھینچ کر رکھ دی ہے۔ یہ تمام رنگ ایک دوسرے میں جذب ہیں اور ایک وحدت کا تاثر دیتے ہیں۔

ایک رنگ زندگی کے جلال و جمال کا پختہ رنگ ہے، فطرت کی تصویروں اور ان کے آہنگ کا احساس ہے جو اس رنگ کو اور پختہ کرتا ہے۔ بہار، چاندنی، برسات اور آندھی جیسی نظمیں اس رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

دوسرا رنگ عشق و محبت کے جمال کا رنگ ہے، 'سوز فراق'، 'طلسم وصال'، 'ملاقات یار'، "جوش جنوں"، 'خواب کا طلسم' وغیرہ اس خاص رنگ کو نمایاں کرتی ہیں۔

تیسرا رنگ معاشرے اور سماج کے جمال کا وہ رنگ ہے جو روایات کا گہرا رشتہ رکھتے ہوئے ہولی کے گلال کے مختلف رنگوں کی طرح بکھرتا رہتا ہے۔ بانسری، شب برات، عید، بسنت، ہولی، دیوالی، راکھی، اس رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

چوتھا رنگ مذہب اور تصوف کا دلکش اور پرکشش رنگ ہے، حمد، نعت، منقبت، مدح اولیس، فقیروں کی صدا، بنجارہ نامہ، رہے نام اللہ کا، توحید، تسلیم و رضا، زندگی اور موت، توکل، فنا، وجد و حال، تلک اور چڑیوں کی تسبیح وغیرہ اس رنگ کی نمائندہ نظمیں ہیں۔

پانچواں رنگ ان نظموں میں نمایاں ہے کہ جن میں وقت اور لمحوں کو عمر کے مدارج کے پیش نظر پیش کیا گیا ہے مثلاً طفلی جوانی، بڑھاپا، موت کا دھڑکا وغیرہ۔

چھٹا رنگ دیومالا اور روایتی کہانیوں سے ابھرتا ہے، جنم کنھیا جی، درگا جی کے درشن، تعریف بھیروں کی، مہادیو جی کا بیاہ، کنہیا جی کی راس اس رس یا رنگ کی نمائندہ نظمیں ہیں۔

ساتویں رنگ کی پہچان حکایات میں ہوتی ہے، قصہ ہنس، کوّے اور ہرن کی دوستی، قصہ لیلیٰ مجنوں، وغیرہ اس رنگ کی عمدہ نظمیں ہیں۔

سات رنگوں کی وحدت کا یہ شاعر اردو ادب میں اپنا ایک بلند ممتاز مقام رکھتا ہے۔ یہ سات سُر ہیں جو مختلف آہنگ رکھتے ہیں اور قاری کے جمالیاتی شعور کو متاثر کرتے رہتے ہیں، قاری کو ایک جمالیاتی وژن عطا کر کے جشن زندگی کی جانب بند دریچے کھول دیتے ہیں۔

☆☆☆

- اپنے مضامین صاف ستھرے کاغذ پر ایک طرف ہی لکھ کر ارسال کریں۔ اگر آپ کی تحریر صاف نہ ہو تو براہ کرم ٹائپ / کمپوز کرا کر بھیجیں۔
- نگارشات کے ساتھ مناسب ڈاک ٹکٹ لگا، پتا لکھا لفافہ ضرور منسلک کریں تاکہ شائع نہ ہو سکنے کی صورت میں آپ کو لوٹائی جا سکیں۔
- حتی الامکان مضمون کے ساتھ سیاہ و سفید تصویر بھی ارسال فرمائیں۔
- مضمون / تخلیق کی زیراکس کاپی کسی بھی حالت میں قابل قبول نہیں ہو گی۔ براہ کرم اصل مسودہ ہی بھیجیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

اکبر کے بعض اشعار کی

شرح

عبدالماجد دریابادی کے قلم سے

اقلیم سخن کے تاجدار لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جن کا بقول اردو کے ادیب شہیر مولانا عبدالماجد دریابادی مثیل و نظیر کہیں مدتوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ان کی ذات ایک طرف شوخی و ظرافت، دوسری طرف حکمت و روحانیت یا معرفت کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھی۔

اردو کے عظیم المرتبت ادیب اور لاثانی طرز انشا کے مالک مولانا عبدالماجد دریابادی ان خوش نصیب لوگوں میں تھے جن کے حضرت اکبر سے تقریباً ایک دہائی تک بڑے نیاز مندانہ تعلقات قائم رہے۔ اس مدت میں ان کی حضرت اکبر صاحب سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ حضرت اکبر کا مستقل قیام الہ آباد میں رہتا تھا اور وہ اکثر منی آرڈر بھیج کر مولانا کو الہ آباد بلا بھیجتے تھے۔ جب کبھی وہ لکھنؤ آتے تو مولانا ان کے دوران قیام میں ان سے ملنے برابر جایا کرتے تھے۔ بہت سے ان کے اشعار مولانا نے خود ان کی زبان سے سنے تھے اور ان کی شرح بھی۔ اسی لیے حضرت مولانا مرحوم اکبر الہ آبادی کے کلام پر درجہ استناد رکھتے ہیں اور انہیں بجا طور سے ان پر Authority سمجھا جا سکتا ہے۔

اس مضمون میں اکبر الہ آبادی کے بعض اشعار کی شرح مولانا دریابادی کے قلم سے پیش کی گئی ہے۔ مولانا نے بڑے ہی جامع اور سیر حاصل انداز میں حضرت اکبر کے کلام پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔ "ظرافت کلام اکبر کی سب سے بڑی نقیب بھی رہی ہے اور کمال اکبر کے حق میں سب سے بڑی نقاب۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا اور ان کی شہرت کو تالیوں نے سراہا لیکن یہ بھی اسی قدر صحیح ہے کہ دنیا محض ایک دل لگی باز سمجھ کر ان کے لطیفوں پر ہنستی رہی اور ان کی شوخیوں پر ہنستی مسکراتی اور ان کے چٹکلوں پر لوٹتی اور کھلکھلاتی رہی۔ ادھر نظر کسی کی نہ گئی اور اگر کسی ایک آدھ کی گئی بھی تو وہ شمار میں نہیں کہ جس ساز سے یہ نغمے نکل رہے ہیں وہ خود کتنے سوز میں ڈوبا ہوا ہے۔

صاحب مثنوی مولوی معنوی کے اس رمز سے تو سب ہی آگاہ ہیں کہ وہ "سر دلبراں" کو "حدیث دیگراں" میں ادا کر جاتے ہیں۔ حضرت اکبر نے بھی کچھ سوانگ اسی طرح کا بھرا اور جو کچھ زمانے کے کڑے تیوروں کے لحاظ سے کھل کر نہ کہہ سکے اسے قہقہوں اور تالیوں کی گونج میں سناگئے اور عذر خواہی یہ کرتے گئے۔

سرد موسم ہے ہوائیں چل رہی ہیں برف بار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

فرمانے کو تو خدا جانے کیا کیا فرماگئے ہیں، مذہب، روحانیت، اخلاق اور معاشرت، تعلیم اور سیاسیات کا کوئی گوشہ ان کے دائرہ التفات سے باہر رہنے نہیں پایا۔ اس ساری داستان کو دہرانے کی قوت کس میں ہے اور اگر کوئی ہمت کر بھی جائے تو سننے والوں کو اتنی فرصت کہاں؟ لیکن اکبر اپنا ایک مخصوص پیام بھی لے کر آئے تھے۔ ہر پھر کر، الٹ پلٹ کر منادی اس کی کرتے رہے، کوئی سنے یا نہ سنے اور سن کر سمجھے بھی نہیں...... بہر حال اپنا پیام انہوں نے سناسب کو دیا۔ پیام کچھ دقیق اور پیچیدہ نہیں، کوئی غامض فلسفہ نہیں۔ سیدھی سادی بات صرف ایک لفظ میں ادا ہو سکتی ہے۔ پیام خودداری کا ہے۔ مشرقی سے کہتے ہیں کہ مشرقی رہ۔ ہندی کو تعلیم دیتے ہیں کہ ہندی بنا رہ۔ مسلمان کے لیے تلقین ہے کہ حدود اسلام سے نہ ہٹ۔ اس ایک ترانے کو خدا جانے کتنے دلکش نغموں میں کتنے دلآویز سُروں میں دوہرا لیا ہے۔

وہ ایک خاص قسم کا دل و دماغ رکھتے تھے اور ایک خاص مقصد حیات لے کر آئے تھے، ایک مخصوص پیام کی تبلیغ کا بار ان کے شانوں پر تھا۔ ان کی آنکھوں نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ ان کا پیام مغربیت کے خلاف رد عمل تھا، ان کی شاعری اول سے آخر تک مادیت و فرنگیت کا جواب ہے۔ ان کے ترکش کا ایک ایک تیر اسی نشانے پر آکر لگتا ہے۔ ان کے فلسفہ، ان کی ظرافت، ان کی سیاست کے دائرے کی معمولی سی پیمائش ممکن نہیں تاوقتیکہ منظر اسی مرکزی نقطہ پر نہ جمالی جائے۔ اکبر سے قبل بنگال کا ایک نامور فرزند بنکم چندر چٹرجی بھی مشن لے کر اٹھا تھا۔ تہذیب جدید کے خطرات کا اس نے پوری طرح اندازہ کر لیا تھا اور بنگالی زبان میں اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ اس سیلاب کو روکنے کی اپنی امکان بھر کوشش بھی کی تھی۔ بنکم نے اپنا حربہ نثر کی شمشیر عریاں کو رکھا تھا۔ اکبر نے اس کی بجائے نظم کے نشتر کو اختیار کیا۔ بنکم کی تلوار کی کاٹ کو سب نے دیکھا اکبر کا نشتر عموماً زیر آستیں رہا۔

ایچ۔ آئی۔ جی۔ ۱۱۔ اے ڈی اے فلیٹ، سرسید نگر، علی گڑھ، یوپی

ان کی ظرافت ہزل گوئی کے مترادف نہ تھی وہ معنویت سے لبریز ہوتی تھی۔ کہیں زبان یا محاورے، لفظی مناسبت اور ترکیب کی ندرت یا قافیہ کی جدت سے شعر کو لطیفہ بنا دیتے تھے۔ سیاسی مسائل میں رائے بڑی آزاد رکھتے لیکن جتنا کہہ جانے میں جری تھے اتنا ہی سنانے میں، چھاپنے میں، پھیلانے میں محتاط تھے۔ ظرافت اس خاص غرض کے لیے ہر حال میں اخفائے خیال کے لیے ان کے ہاتھ میں اچھے لفافے کا، بڑے کار آمد آلے کا کام دیتی تھی۔ جو کچھ اور جس کی نسبت چاہتے اس پردے میں سنا جاتے۔ کچھ اکیلی سیاست پر موقوف نہیں، رند و پارسا، امیر و فقیر، عالم و عامی، انگریز و ہندوستانی، ہندو مسلم، شیعہ سنی سب کی صحبت میں، اور مسجد و مندر، کالج اور اسکول، خانقاہ و مے کدہ، کونسل اور کچہری، سرکس اور تھیٹر، بازار اور دفتر کے ایک ایک گوشہ میں بے تکلفانہ سیر کرتے پھرتے، ایک ایک شے کا جائزہ غور سے لیتے رہتے، اسے جھانکتے اسے تاکتے، اسے جانچتے اس کو بھانپتے، ایک کو تولتے دوسرے کو ٹٹولتے لیکن نقاب چہرے پر کچھ ایسے گہرے پڑے رہتے کہ کسی کو پتا بھی نہ چلنے پاتا کہ نگاہیں ہیں کس جانب۔ کہیں کہیں مجموعہ کلام میں اقرار کر گئے ہیں۔ ایک جگہ واضح لفظوں میں کہتے ہیں:

لغزشیں مد ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر
دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اس کو معاف

موسم کا اشارہ زیادہ تر اس وقت کی سیاسی فضا کی جانب ہے اور ہواؤں سے مراد قانونی شکنجے اور سرکاری گرفتیں تھیں۔ ان کی ظرافت کا بہت بڑا ہدف سیاسیات کا میدان تھا اور اس باب میں ان کا عمل، عارف رومی مولانا روم کی تعلیم پر تھا۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

وہ ان دلبران سیاسی کی ایک ایک ادا کے محرم تھے۔ ان اسرار کی منادی وہ سر بازار کرتے ہیں لیکن زبان وہی اپنی مخصوص۔ جو لوگ ان کی اس بولی سے واقف ہو گئے تھے وہ اس کے مفہوم کو سمجھ کر چشم و ابرو کو جنبش دیتے اور جو تہ تک نہ پہنچتے وہ بھی بہر حال دل لگی کی بات سمجھ کر کچھ تو ہنس پڑتے تھے۔ بت، صنم، مس، شیخ، سید، سید صاحب، اونٹ، گائے، کلیسا، حرم، دیر، بت کدہ، کالج، برہمن، لالہ، صاحب وغیرہ بیسوں الفاظ نے ان کی زبان میں کہنا چاہیے ایک مخصوص اصطلاحی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ ان کے اس شعر:

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال
خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

کی شرح مولانا دریابادی ان لفظوں میں کرتے ہیں۔ "سرکار نامدار یعنی برطانوی حکومت کے بعض نیک نام محکموں اور سر رشتوں کی ذہانت، طباعی بلکہ قوت خلاقی کے مشاہدہ سے یہ ظریف شاعر بھی دنگ رہ جاتا ہے اور محکمہ پولیس کی کار گزاریوں کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ شاعر غریب کو سیاسی مسائل سے کیا سروکار؟ اس کے اسلاف صدہا برس سے یار کی کمر تلاش کرتے آئے ہیں آج تک پتا نہ لگا۔ خواجہ خضر کی رہنمائیاں ہاتف غیب کی دست گیریاں سروش غیب کی مددیاں سب کی سب ناکام رہیں۔ شاعر کا ذہن ادھر منتقل ہوتا ہے کہ اس معدوم کا پتا اس سرکاری خفیہ پولس ہی کی مدد سے کیوں نہ چلایا جائے۔"

اکبر کے زمانے میں مغربی تہذیب، معاشرت پوری طرح سارے ملک پر مسلط تھی اور اس کی وجہ سے علم، ہنر اخلاق کے ساتھ حسن و عشق عیش و عشرت سب کا معیار بدل گیا تھا اور ہندوستانی رنگینیوں اور تعیش پسندیوں تک کے معیار مغربی ہو گئے تھے۔ یہ کہانی اکبر کے اس شعر میں ادا ہوئی ہے۔

فکر ساری کی ہے نہ نگین کی
اب تو دھن ہے انہیں فرنگن کی

مزید دو شعروں کی شرح مولانا دریابادی سے سنئے:

خامشی سے ہے تعلق نہ ہے تمکین کا ذوق
اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق
شان سابق سے وہ مایوس ہوئے جاتے ہیں
بت بھی اب دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

"ادھر عاشقوں کا حال تو بدلا ہی تھا غضب یہ ہوا کہ محبوبوں کی جماعت بھی انقلاب زندہ باد کی نذر ہو گئی۔ ادھر کی وضعداری میں فرق آیا تو ادھر کی بھی طرح داریاں کب اپنے رنگ پر قائم رہیں، بازار حسن میں چلن نئے سکوں کا ہو گیا پرانے سکے ٹکسال سے باہر ہو گئے۔ مشرق اور مشرق کی شاعری میں سب سے بڑا زیور شرم و حیا تمکین و حجاب سمجھا جاتا تھا لیکن اب جو جا کر دیکھا تو محفل ناز کا رنگ ہی بدلا ہوا۔ کہاں کی کم سخنی اور کیسی بے زبانی جو مشق اب خطابت کی ہو رہی ہے۔ نہ اب نگاہ شرمگیں نہ چشم سرمگیں، اٹھی ہوئی نگاہیں اور چڑھی ہوئی آنکھیں اب خود محو نظارہ، چہرہ پر نقاب کے ریشمی تاروں کی جگہ شفاف پتھروں کی عینک اور سنہری کمانیاں۔ حجلہ عروسی کی خلوتوں کا تخیل مٹ مٹا کر ڈرائنگ روم میں شانہ محفل طرازی و بزم نوازی کے جم رہے ہیں۔ چوتھے مصرعے نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے مفہوم کو جا ہے جتنی وسعت دیتے چلے جائیے۔

ہندستانی تہذیب و ہندوستانی حکومت اغیار کی حکومت اور بیرونی تہذیب سے تو بہر حال گوارا تر ہے۔ اس مفہوم کو جن خوش ذائقہ کنایوں سے ادا کیا گیا عجب نہیں کہ ان سے اہل ذوق کی زبان چٹخاریاں لینے لگے۔

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دہاتی
بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

پوری چپاتی اور بسکٹ تینوں کی تشبیہیں بالکل صاف ہیں پھر دیس کی دھن، تو ایک معنی تو اس کے ظاہر ہی ہیں کہ وطن کا جوش محبت باقی دھن ایک اصطلاح موسیقی کی بھی ہے اور دیس نام ہے ایک راگ کا اور پھر یہ گانا ایک دیہاتی کی زبان سے نور علی نور:

نیت دنیا طلبی و دنیا پرستی کی لیکن آڑ مذہب کی، مقصود و مطلوب دنیا لیکن زبان پر نام

دین مذہب کا۔ اکبر یہ رنگ دیکھتے ہیں اور ذرا دیکھئے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر صدا کیا لگاتے ہیں:

فرماتے ہیں یہ خوب بھائی گھورن
دنیا روٹی ہے اور مذہب چورن

کھانا ٹھونس ٹھونس کر کھالیا جاتا ہے تو آخر چورن کی ضرورت پڑجاتی ہے یہ نہیں کہ چورن کچھ دل سے مرغوب ہو۔ مقصود مرغوب تو وہی کھانا ہی ہے لیکن کام نکلتا نہیں بغیر چورن کی مدد کے۔ مقصود تو وہی دنیا ہی ہے لیکن آڑ بہر حال مذہب کی۔

زمانہ کی بیقدری شاعری کی دنیا کا بڑا پرانا مضمون ہے۔ شاعر سدا سے سامعین کی بدمذاقی اور ناقدر شناسی کا رونا روتے چلے آئے ہیں لیکن یہی صدائے درد جب چمنستان ظرافت کے اس عندلیب کی زبان سے نکلتی ہے تو نغمہ لطیف بن کر کان میں آتی ہے۔ رلاتی نہیں ہنساتی ہے اور چٹکی گدگدی میں تبدیل ہو کر رہتی ہے:

قدر دانوں کی طبیعت کا عجب رنگ ہے آج
بلبلوں کو بھی ہے حسرت کہ وہ الو نہ ہوئے"

اسی طرح ایک اور شعر شرح مولانا دریابادی نے ان الفاظ میں کی ہے:

کھلا دیواں مرا تو شور تحسین بزم سے اٹھا
مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

"اردو دانوں، اردو خوانوں، اردو نویسوں کی بزم میں سبحان اللہ اور مرحبا کی کیا کمی، تحسین کے وہ غلغلے، آفریں کے وہ آوازے بلند ہوں کہ محفل کی محفل گونج اٹھے، در و دیوار ہل مل جائیں لیکن لفاظی کے اس شور ہنگامے کے آگے؟ بس خلا ہی خلا ہے۔ بڑی علمی تحقیق و کاوش میں سر کھپائیے۔ مطبع دانوں کے دروازے پر دستک دیجئے، ان کے سارے شتر غمزے برداشت کیجئے، وعدے وہ صبر آزما کہ پریس کے شکنجہ میں کتاب کے مضمون کے ساتھ ساتھ اپنی روح کو بھی دبوائیے اور جب خدا خدا کر کے کتاب پریس سے باہر آئے تو خود ہی اشتہار لکھئے اور پھر مدتوں خود ہی پڑھتے رہئے، کتابیں یا تو دوستوں کو ہدیۃً تقسیم کر دیجئے ورنہ ڈھیر اپنے سامنے لگا دیکھ کر بس خوش ہوتے رہئے۔ یہ خشک حقیقت اردو اہل قلم کے لیے کیسی ہی یاس انگیز، دل شکن ہمت توڑ سہی لیکن دیکھئے ظرافت کی مسیحائی نے اس بے جان لاش میں کیسی جان ڈال دی:

کھلا دیواں مرا تو شور تحسین بزم سے اٹھا
مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا"

شاعروں کے ضعف و ناتوانی کا مضمون العظمۃ للہ ضرب المثل کے درجے تک پہنچا ہوا ہے جسے دیکھئے سب ہی اپنی صحت سے نالاں، اپنی لاغری سے متعلق نوحہ خواں ملتا ہے۔ حضرت اکبر نے اس پامال مضمون میں ندرت یہ پیدا کی کہ کمزور و ناتواں اپنی صحت ہی کو نہیں اپنی بیماری کو بھی باندھا اور اپنے نہ مرنے کو اپنی بیماری کی کمزوری کے بل پر ثابت کر دکھایا۔ فرماتے ہیں:

کمزور ہے میری صحت بھی کمزور مری بیماری بھی
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

ندرت قوافی کے بادشاہ تھے، ایسے ایسے نادر قافیے ڈھونڈھ کر لاتے کہ ان کے تصور ہی سے دوسروں کا قافیہ تنگ ہو جائے۔ یوں کہئے کہ ان کے تنگ دان ظرافت کی نمکینی اکثر یہی جنس نایاب قائم کیے ہوئے ہے۔ ایک جگہ بڑھاپے کی آپ بیتی دکھ درد کی کہانی سناتے ہیں لیکن طبیعت کی شوخی کا یہ عالم کہ سننے والوں کو رلانے کی جگہ ہنساتے جاتے ہیں:

ہر طرح راحت تھی مجھ کو دانت سے
قافیہ ان کا ملا تھا آنت سے
صحت اب بگڑی تو ان میں درد ہے
اس طرف دیکھو تو معدہ سرد ہے
خواب راحت کس کو، کھانا کون کھائے
رات بھر کرتا رہا ہوں ہائے ہائے
درد کے آگے رہا منجن بھی گرد
مصطگی بھی رہ گئی بارۂ زرد

ایک دوسرا زعفران زار اس سے بھی بڑھ کر ملاحظہ ہو:

دانت کا درد بدستور چلا جاتا ہے
وہی مازو وہی کافور چلا جاتا ہے

مازو اور کافور دانت کے امراض کی مشہور دوائیں ہیں:

ڈارون کے اسی لکچر کا سبق ہے اب تک
وہی بندر وہی لنگور چلا جاتا ہے

ڈارون انگلستان کا مشہور سائنس داں جس کے نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوع ترقی کرتے کرتے دوسری نوع بنتی گئی ہے۔ یہاں تک کہ حیوانات کا ارتقا انسان پر ختم ہوا اور انسان ترقی یافتہ بندروں کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے۔

برق کے لیپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ
روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

روشنی اور نور کا یہ نازک فرق اس سے قبل کسی کو کیوں سوجھا ہوگا اور پھر برقی لیمپ، سبحان اللہ، نور علی نور۔ ان دونوں شعروں میں جان محض قافیہ نے ڈال دی ہے۔

جو سچی بات ہے کہہ دوں گا بے خوف و خطر اس کو
نہیں رکنے کا میں ہرگز بری ٹوکے کہ جن ٹوکے
اتار آتے جو کابل سے تو پڑتے سب کے حصے میں
امیر آئے تو کیا آئے مزے ہیں لارڈ منٹو کے

لارڈ منٹو اس وقت ہندوستان کے وائسرائے تھے اور امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ان ہی کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے۔ "منٹو کا قافیہ" "جن ٹوکے" لانا بس اکبر ہی کا حصہ تھا۔

ظریفانہ کلام میں بارہا الفاظ پست و مبتذل لاتے لیکن موقع ایسا چھان کر نکالتے، بندش اس خوبی سے کرتے اور مصرعہ اس ٹھاٹھ کا رکھتے کہ پستی و ابتذال غائب، کلام میں بجائے تنافر کے لطف و شگفتگی کہ مذاق سلیم پکار اٹھتا کہ بیشک اس خاص موقع کے لیے یہی لفظ مناسب تھا اور یہی موزوں۔ مثلاً اقبال کی مشہور نظم "جواب شکوہ" کا وہ مشہور بند تو سب کے ذہن میں ہوگا:

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب
زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب